بہاتے دیکھ کر حیران بھی ضرور ہوتا۔ دوپہر کو کمپاؤنڈر کا لڑکا اسلم اور وہ گھڑونجی سے سیلی سیلی ریت نکال کر اور اپنا پاؤں اس میں ڈال کر دیر تک تھپتھپاتے رہتے۔ اس سے پاؤں کھینچا جاتا اور اللہ میاں کی گھوڑی بن جاتی۔ پھر وہ اسکیمو خانہ طرح طرح کی چیزوں سے سجایا جاتا۔ جن میں بوتلوں کے کارک اور گتّے کی ڈبیاں کثرت سے ہوتیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا سا مکا ہوا میں لہراتا اور گھوڑی کی پیٹھ کر پڑتے ہی صدا نکلتی۔ ''تیری گھوڑی پھس'' اور پھس گھوڑی کا مالک اپنی خانہ بربادی کا خیال کیے بغیر دوسرے کی گھوڑی پھس کر دیتا۔ اس صحن میں باغ اور نہانے کا تالاب ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے بیسیوں کمرے بنتے جن کے درمیان ایک بڑا ہال کمرہ ہوتا۔ باغ کے ایک طرف گھاس کے میدان میں بھینس، گھوڑے اور اونٹ باندھ دیے جاتے۔ دروازے کے ساتھ ایک موٹر گراج ہوتا جس میں ایک چھوٹا سا کارک ڈال دیا جاتا۔ کمروں میں جھاڑو کے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو گاڑ کر آدمی بنا دیے جاتے جو نہایت مہذّب ہوتے اور دُور دور کھڑے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو وہ دونوں ایک دم کھڑے ہو جاتے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اس مکان کی دیواریں الانگ جاتے۔ پھر پاؤں کے تلوؤں میں شدّت کی کھجلی اٹھتی لبوں پر یہ قومی ترانہ پھڑکنے لگتا۔

ہاتھوں سے بنایا تھا۔۔۔۔۔ پاؤں سے مٹایا ہے

اور سارا گھر ذّرہ ذّرہ ہو کر دُور دُور تک پھیل جاتا۔ اس اثنا میں اگر کمپونڈر صاحب اچانک ادھر سے گزرتے تو اپنے بیٹے کے سر پر تین چار تھپڑ مار کر آصف سے کہتے۔ ''ڈاکٹر صاحب کو بتاؤں گا۔'' تو آصف اپنے دوست کی بے عزتی دیکھ کر انھیں واحد حاضر صیغہ سے مخاطب کر کے ٹھینگا دکھاتا۔ ''جا کہہ دے۔ ایک دفعہ چھوڑ کے سو دفعہ کہہ دے۔ ہم کوئی تیرے باندھے تھوڑی ہیں۔''

لیکن کمپاؤنڈر صاحب کبھی نہ کہتے۔

شام کو وہ اسلم کے کوارٹر میں اس کی امّی کے پاس چلا جاتا اور چولھے کے پاس بیٹھ کر اس کی کہانیاں سنا کرتا۔ وہ مذہبی قسم کی عورت تھی۔ جن پریوں کی کوئی کہانی اسے نہ آتی تھی۔ پیغمبروں اور بزرگوں کے قصے سناتی رہتی۔ وہ رات گئے تک انہی کے یہاں بیٹھا رہتا۔ ڈاکٹر صاحب اس دوران میں سو جاتے۔ رحیم بخش دودھ میں جامن ڈال کر حقہ گڑگڑاتا کمپاؤنڈر صاحب کے کوارٹر کے آگے جا بیٹھتا اور ہر پندرہ بیس منٹ بعد ہانک لگاتا۔ ''آصف میاں، اب آ جاؤ۔''

لیکن آصف میاں۔ ''اچھا، کہہ کر جوں کے توں اسی جگہ بیٹھے رہتے۔ رات گئے جب اسلم کی امّی سونے لگتی تو وہ چمکار کر اسے بھی باہر بھیج دیتیں۔

جس دن اسلم سکول میں داخل ہو گیا آصف کے لیے ساری دنیا گویا تاریک ہو گئی۔ ابا سے کہہ سن کر اس نے بھی اسلم کے ساتھ سکول جانا شروع کر دیا۔ دن رات کی اس بے طرح دوستی نے ہنگاموں میں اور اضافہ کر دیا اور ہسپتال میں وہ دھما چوکڑی مچی کہ سب کو تنگ آ گئے مگر ڈاکٹر صاحب اس ہلڑ سے اکتائے نہیں۔ ان کی طبیعت نفاست پسند اور امن طلب ضرور تھی مگر آصف سے کچھ کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ایک تو شاید اس وجہ سے کہ پیٹ پونچھن تھی، دوسرے اس لیے کہ خانہ جنگی میں اس نے ہوم گورنمنٹ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

ہسپتال میں کوئی ایسی بوتل نہ تھی جس کا کارک نہ اترا ہو۔ کوئی پچکاری ایسی نہیں تھی جس میں لال نیلا رنگ بھر کر نہ چھوڑا گیا ہو اور

گتے کی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں تو گویا اسی لیے تھیں کہ لڑھکا کر مویشیوں کے کھروں تلے پہنچا کر تماشا دیکھا جائے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی عینک کا شیشہ دو دفعہ لگ چکا تھا۔ ان کا پن جسے گوند سے لتھیڑ کر لکھنے کو کوشش کی گئی تھی اب نہ تو روشنائی کھینچتا تھا اور نہ لکھتا تھا۔ لپٹے ہوئے بستروں پر روزانہ سواری ہوتی اور انھیں پچکا کر تکیہ بنا دیا جاتا۔ دونوں رحیم بخش سے ضرور ڈرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کی ایک بھی نہ مانتے تھے۔ وہ ان کے سامنے سارے کھیل کھیلتے، زور زور سے ہنستے، شور مچاتے اور قلابازیاں لگاتے۔ پھر ڈاکٹر صاحب انھیں کیسے روکتے!

مہینہ کے آغاز پر رحیم بخش ڈاکٹر صاحب کی تنخواہ لے کر ان کی بیوی کو دینے جایا کرتا۔ اس دفعہ جو وہ جانے لگا تو آصف بھی مچل گیا کہ میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سمجھایا، لالچ بھی دیا مگر وہ نہیں مانا۔ یہی کہتا رہا۔ ''میں اماں کے پاس جا کر پڑھوں گا۔'' ناچار بھیجنا پڑا۔ تیسرے دن جب رحیم بخش واپس پلٹنے لگا تو آصف نے اپنی اماں سے کہا۔ ''میں ابا کے پاس جاؤں گا اور اپنے دوست سے کھیلوں گا اور وہیں پڑھوں گا۔ اس نے روکا نہیں اور رحیم بخش کے ساتھ سوار کرا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نیم کے تلے بیٹھے پرچیاں کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے دور سے رحیم بخش کو گھوڑے پر آتے دیکھا۔ آج خلافِ معمول رحیم بخش کا گھوڑا قدم قدم چلا رہا تھا۔ ہسپتال سے تھوڑی دور پرے آصف نے اس کے پیچھے سے سر نکالا اور چلایا ''ابّا، میں پھر آ گیا۔'' اور ڈاکٹر صاحب کو ایسے لگا جیسے ان کی بیوی نے انھیں جیتا جاگتا طعنہ بھیجا ہو! اب کی بار وہ آصف سے ذرا سرد مہری سے پیش آئے۔ اس کی شرارتوں کو گھور گھور کر دیکھا اور گاہے گاہے اس ٹوکتے بھی رہے۔ شام کو قاعدہ لے کر اسے خود پڑھاتے، تختی پر اصلاح دیتے اور رات کو لیٹ کر گنتی سنتے۔ آصف جس پابندی کے خوف سے اماں کے پاس نہ رہا تھا وہ اب یہاں بھی پہنچ گئی۔ اب اس نے تہیہ کر لیا کہ اس دفعہ رحیم بخش کے ساتھ ایسا جاؤں گا اور پھر نہیں آؤں گا اور جب مہینہ شروع ہوا تو اس نے بہانے بہانے رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس خلل کو برداشت نہ کر سکے اور اسے پھر اماں کے پاس بھیج دیا۔ لیکن اماں صرف جھڑکیوں اور گھرکیوں پر ہی اکتفا نہ کرتیں کبھی کبھار ایک آدھ طمانچہ یا دھموکا بھی لگا دیتیں اور پھر آصف سے تو انھیں خاص چڑ تھی جو بیٹھے بیٹھائے ابا کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا تھا۔

چھتوں پر مٹی ڈالنے اور کمروں میں سفیدی کرنے کے لیے رحیم بخش کوئی ہفتہ بھر وہاں رہا۔ اس دوران میں آصف کو اماں کے سوتیلے پن سے زیادہ اسلم کی یاد پر غصہ آیا جو رہ رہ کر اس کے دل میں ڈبکیاں لگا کر اسے بے چین کیا کرتی۔ جاتے وقت اس نے رحیم بخش کا تہمد تھام کر کہا۔ ''مجھے پھر ابّا کے پاس لے چلو۔'' تو اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''اماں سے پوچھ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

آصف ڈرتا ڈرتا امّاں کے پاس گیا اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ ابھی اس کے بڑے بھائی کو پیٹ کر بیٹھی تھی۔ بھنّا کر بولی۔

''جاؤ جاؤ! خدا کے لیے سب اسی کے پاس چلے جاؤ۔ دفان ہو جاؤ، مر جاؤ۔''

آصف نے اس کے غصہ سے فائدہ اُٹھایا اور آ کر رحیم بخش کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اس دفعہ ڈاکٹر صاحب نے آصف کو تو کچھ نہ کہا لیکن رحیم بخش کو اچھی جھاڑ بتائی۔ وہ جہاں ان کی اتنی جھڑکیوں کی سینہ سے لگائے پھرتا تھا ایک اور کو بھی اسی کھاتہ میں جمع کر گیا۔ اب آصف کی تعلیم میں پہلے سے زیادہ سختی برتی جانے لگی۔ اُسے بہت زیادہ کام دیا جاتا۔ رات کو کھڑے کر کے گنتی اور نظمیں یاد کرائی جاتیں۔ دن میں

دو تختیاں لکھوائی جانے لگیں اور صبح جلدی اُٹھالیا جاتا۔ اُسے اماں کی قدر و عافیت اب معلوم ہوئی لیکن اس تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ مہینہ کے شروع میں رحیم بخش پھر گاؤں گیا مگر اسے چھٹی مانگنے کی ہمت نہ ہوئی اور اگر وہ ہمت کر بھی لیتا تو اسے اجازت کبھی نہ ملتی۔ اسلم کے ساتھ کھیلنے میں اب وہ لطف نہیں رہا تھا۔ بہت تھوڑا وقت ملتا اور بہت کم باتیں ہوسکتیں۔ ان کے گھر جانا بھی ممنوع تھا۔ اس طرح سے بہت سے قصے جو اسلم کی امّی نے ابھی اُسے نہیں سنائے تھے پیدائش سے پہلے ہی سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ اس دن بھر کی مصروفیت سے تنگ آ کر آصف کا دل چاہا کہ چند دنوں کے لیے بیمار بن جائے اور مزے سے لیٹ کر ان سنہری دنوں کو یاد کرتا رہے۔ جب اس نے ابا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اُسے بیمار ہونے کا کوئی مناسب ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ اسی طرح آئیں بائیں شائیں کرتا رہا اور ایسے ہی پھرتے پھرتے اس کے سر میں زور کا درد اٹھا اور وہ بخار سے لیٹ گیا۔ سر درد کی شدت اور بخار کی حدت سے اُسے آرام نہ ملا۔ دو چار دن تک تو ڈاکٹر صاحب خود دوا دارو کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک صبح اُسے رحیم بخش کے ساتھ سول ہسپتال بھیج دیا۔ وہاں سے آئی ہوئی دوا کڑوی ضرور تھی مگر مفید نہ تھی۔ آصف علیحدگی میں رحیم بخش سے کہتا رہا کہ مجھے اماں کے پاس چھوڑ آؤ مگر اس نے کوئی پروانہ کی۔ ایسے ہی ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے ابّا سے بھی کہہ دیا مگر وہ رکھائی سے ٹال گئے۔ اس کے بعد اُسے اماں اماں کی رٹ کے دورے پڑنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ڈاکٹر صاحب کو سونا دوبھر ہو گیا اور یہ انھیں گوارا نہ تھا۔ سب چیزوں سے نیند پیاری تھی۔ فوراً تانگہ منگوا کر دوائی کی بوتل سمیت اس کی اماں کے پاس بھیج دیا اور خود برآمدے میں چارپائی کھینچ کر گھوک سو گئے۔

گاؤں پہنچتے ہی آصف کا بخار اتر گیا اور وہ چند دن صرف اسی لیے بستر سے نہ اُٹھا کہ اماں کی نظرِ کرم فوراً بدل جائے گی لیکن اسے وہ بستر فوراً خالی کر دینا پڑا کیوں کہ اس کے بڑے بھائی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ ایک آدھ ہفتہ تک تو سب اسی خیال میں رہے کہ معمولی بخار ہے اتر جائے گا۔ پر جب ٹمپریچر بڑھتا گیا اور اس کی حالت غیر ہوتی گئی تو ڈاکٹر صاحب کو بلوا بھیجا۔ وہ اسی دن شام کو وہاں پہنچ گئے۔ بچے کو دیکھا۔ قریبی ڈاکٹر کو بلایا گیا اس کے ٹیکے لگنے شروع ہو گئے۔ تھوڑے عرصے میں بخار اتر گیا اور شریر لیٹے لیٹے پاس سے گذرنے والے ہر آدمی کو ٹک ٹک دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے جانے کی تیاری شروع کر دی تو آصف پھر ان کے ہمراہ تیار ہو گیا لیکن ڈاکٹر صاحب نہیں مانے۔ وہ رونے لگا تو جھڑک دیا گیا۔ اس نے اماں سے کہا تو وہ بھی جھنجھلا کر بولیں۔ ''کیا کرے گا وہاں جا کر؟ پہلے کون سی ایسی خاطر ہوئی جواب پھر تیار ہو گیا ہے۔ ایک بار جو شرماشرمی لے گئے تو تُو اسی پر بھول بیٹھا ذرا آئینے میں اپنا حلیہ تو دیکھ۔ ہلدی کا گانٹھ بنا ہوا ہے۔ دو دن بخار چڑھا اور اُٹھا کے میرے پاس بھیج دیا۔ کسی کی بکری، کون ڈالے گھاس! باپ کا دل اور ایسا کٹھور۔ پھر کوئی تجھ سے پوچھے۔ جب وہ میری نہیں سنتا تو تیری کیسے مانے گا۔ ایک تولے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔ اُسے اپنے کھل کھیلنے سے فرصت ہو تو تیری خبر گیری کرے۔ وہاں کی چڑی سے یہاں کی روکھی اچھی۔ میرے تھپڑوں سے وہاں کی سڑی بساندھی باتیں اچھی نہیں؟ جہاں میں آفت کی ماری ٹھڈا ٹوٹی پڑی ہوں تو بھی نچلا ہو کے بیٹھا رہ۔ محلوں کے خواب دیکھے گا تو جھونپڑے کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔''

وہ تو شاید اتنی لمبی چوڑی تقریر نہ کرتیں لیکن ڈاکٹر صاحب جو ساتھ کے غسل خانے میں دانت صاف کر رہے تھے صرف انھیں سنانے کی غرض سے آواز کو بھی اُونچا اور مضمون کو بھی لمبا کرنا پڑا۔ بیگ میں کپڑے ڈال کر ڈاکٹر صاحب نے آصف سے کہا۔ ''فوراً تیار

ہو جاؤ۔ میں تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔'' ابّا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جھٹ چھوٹی سی گٹھڑی باندھ کر بیگ کے پاس لا کر رکھ دی۔ اسٹیشن گاؤں سے یہی کوئی میل ڈیڑھ میل تھا۔ ڈاکٹر صاحب گھوڑے پر چڑھنے سے کتراتے تھے۔ اس لیے چکر کاٹ کو ریل گاڑی کا سفر کرتے تھے۔ جاتی دفعہ اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا کل پھر نہ بھاگ آنا۔ وہاں رہے گا تو پڑھ لکھ کر صاحب بنے گا۔ یہاں تو لے دے کے ماں کی مامتا ہے۔''

اسٹیشن کو جاتے ہوئے آصف نے ایک دو دفعہ ابّا کو بلایا مگر وہ بولے نہیں۔ یونہی چلتے رہے۔ گاؤں سے باہر نکل کر سرکنڈوں اور بیری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے درمیاں سے گذرتے انھوں نے ذرا رک کر ایک سرکنڈا توڑ لیا اور آصف کے کندھے پر پورے ہاتھ کا وار دیا۔ وہ بلبلا کر اچھلا اور اس کی گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر راہ میں گر گئی۔ اس نے مڑ کر رحم طلب نگاہوں سے باپ کو دیکھا مگر اس کے جواب میں دو نیلی نیلی آنکھیں اس کی پنڈلیوں پر نقش ہو گئیں۔ سرکنڈا پڑتے ہی ایک خفیف سا دھکا لگتا۔ پھر جسم میں حرارت پیدا ہوتی اور آگ کی ایک لاٹ کیچڑ میں ڈوبے ہوئے سانپ کی طرح اوپر ابھرتی اور سارا جسم اس کی حدت سے تمتما اٹھتا۔ سانپ پھر کیچڑ میں دھنس جاتا مگر باہر ایک تیزابی کینچلی چھوڑ جاتا جو کروٹیں بدل بدل کر گویا دھکتی رہتی۔ پھر ٹوٹ کر گرتی اور ایک سانپ اور پھنکارنے لگتا۔ اس طرح اس کے بھورے رنگ کے جسم پر کلر کے بہت سے کوڑیالے لہرانے لگے! کبھی وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا اور کبھی ہولے ہولے اونٹ کی طرح دوڑنے لگتا۔ مگر رفتار کی تیزی ضربوں کی شدت میں کوئی تخفیف نہ کر سکتی۔ اس کے منہ سے مسلسل چیخوں کے علاوہ ''ابا میری توبہ! ابا جی میری توبہ!'' لرز لرز کر نکل رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایک ہی رفتار سے پیٹے جا رہے تھے۔ ''حرام زادے، چغل خور، لگائی بجھائی کرتا ہے۔ اس کمینی سے میری شکائتیں کرتا ہے۔ اب درست ہو جائے گا۔ ذلیل انسان۔ کتے کی اولاد، سؤر کا بچہ۔۔۔۔ ایسی دوں فطرت عورت میرے منہ آئے۔ ایک سید زادے کے منہ۔ جس نے آج تک کسی سے تو نہیں کہلوایا، تُو نہیں کہلوایا۔ حرام زادے تو نہیں کہلوایا۔'' اور پھر ہر تو کے ساتھ سرکنڈے کی ''ژوں'' میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر سے وہی صدا بلند ہوئی، وہی ''ابا جی میری توبہ! ابّا جی میری توبہ۔'' جو آہستہ آہستہ دیووں کے کنوئیں میں مجوس سیاہ آنکھوں والی آدم زاد کی سسکیاں بنتی گئی۔

اسٹیشن سے تھوڑی دور ادھر ڈاکٹر صاحب نے سرکنڈا پرے پھینک دیا اور آصف کی گٹھڑی اسے دے دی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے دو کیلے خریدے۔ ایک خود کھانے لگے اور دوسرا اسے۔۔۔۔۔ دیا مگر آصف نے کھایا نہیں اپنی گٹھڑی میں رکھ لیا۔ پھر وہ سامنے والے ٹین کے چھوٹے سے کمرے میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے اپنی رانوں اور پنڈلیوں پر مار کے نشان غور سے دیکھے انھیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے۔ منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر اس نے دو دفعہ زور سے ''اماں! اماں!'' کہا اور پھر اپنی قمیص سے آنسو پونچھ کر باہر آ گیا۔

مسافر خانے کی آہنی چھت پر بہت سے کبوتر ایک دوسرے سے چونچیں لڑا رہے تھے۔ ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور پنجوں کی خراشیں ہی اس خاموش فضا میں ایک مسلسل آواز تھی۔ چھوٹے سے اسٹیشن ہر چند مسافر اونگھ رہے تھے۔ ایک چھابڑی والا پھل، سگریٹ، دال روٹی اور شربت بیچ رہا تھا۔ سارے مسافر خانے میں صرف ایک ہی پوسٹر تھا۔ ''قطار باندھ کر ٹکٹ خریدیے'' باہر لکڑی کی ایک چھوٹی سی

سبز رنگ کی چھونپڑی میں پینے کا پانی رکھا تھا۔ بنچوں پر روغن کے علاوہ میل کا ایک دبیز غلاف چڑھا ہوا تھا اور ہوا میں پھلوں، سگریٹوں، پان کی پیک، پتھر یلے کوئلے کو دھوئیں اور زنگ آلود لوہے کی بو لہرا رہی تھی جو ایک جگہ جمع ہو کر اسٹیشن کا نام پاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آصف کے آنسوؤں سے دھوئے دھائے چہرے کو دیکھا اور اس کے لیے شربت کا ایک گلاس لائے مگر اس کی طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ صرف ان کی دہشت سے رعب کھا کر اس نے ایک دو گھونٹ بھر لیے اور انھیں عاجزی سے تکنے لگا۔ باقی ماندہ شربت ڈاکٹر صاحب نے خود پی لیا اور پھر اس کے ذرا قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

اگلے اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب نے اسے ایک سنگترہ لے دیا اور خود ایک ہم سفر کا اخبار دیکھنے لگے۔ آصف کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا باہر بھاگتے ہوئے درختوں اور کھمبوں کی اوپر نیچے ہونے والی تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کے ڈھیلے ڈھیلے ہونٹ ایکا ایکی تالی سی بجاتے۔ اس کی سانس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ناک میں داخل ہوتی اور اس کے جسم کو ایک ساتھ تین چار جھٹکے لگتے جیسے کیچڑ میں دھنسی ہوئی لاری نے باہر نکلنے کو زور لگایا ہو تو اسے ٹھنڈک سی محسوس ہوتی اور ایک سسکی کھڑکی کے راستے گاڑی سے باہر نکل جاتی۔

گھر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے اسے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ اسی وقت گٹھڑی میں سے ایک کتاب نکال کر بوری بچھا کر بیٹھ گیا۔ شام کو وہ کل کے سپاہی کی طرح ان کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر گانے لگا۔

مسافر غریب ایک ستے میں تھا

وہ چوروں کے ہاتھوں میں جا کر پھنسا

اور جب یہ نظم ختم ہو گئی تو دونی کا پہاڑہ سنانے لگا اور جب وہ تین کا پہاڑہ شروع کرنے والا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''بس ٹھیک ہے۔ اب سو رہو۔''

''اچھا جی'' کہہ کر وہ ساتھ والی چارپائی پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ حقہ کی نَے پرے دھکیل کر ڈاکٹر صاحب وضو کرنے کے لیے اُٹھے تو انھوں نے آصف کی کھلی ہوئی گٹھڑی کو برآمدے میں دیکھا۔ وہ خراماں خراماں ادھر گئے۔ اسے کھولا اور کپڑوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ سب سے آخری کپڑے کے نیچے ایک کیلا اور سنگترہ پڑا تھا۔

اب ہسپتال میں نہ کوئی شرارت ہوتی تھی۔ نہ شور مچتا تھا۔ اسلم کی ماں نے کئی مرتبہ اسلم سے کہا کہ اپنے دوست کو بھی کہانیاں سنانے کے لیے لایا کر۔ مگر دوست آتا تو اسلم لاتا۔ کئی بار اسلم نے ریت کے گھر بنانے کو تجویز پیش کی۔ پچھلے دنوں کی مزیدار کھیلیں یاد کرائیں۔ ہسپتال سے چیزیں چرانے کا لالچ دیا مگر وہ نہیں مانا۔ تنگ آ کر اسلم نے اپنے پچھواڑے گورکن کے لڑکے مہندی سے راہ و رسم پیدا کر لی اور آصف سے کٹی کر دی۔

آصف کو اس طرح خاموش دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو بہت دکھ ہوا۔ اس کی رفتار اور گفتار سے گھر پر مردنی سی چھا گئی تھی۔ چلتا تو ایسے لگتا جیسے غبار آلودہ دوپہر کو صحن میں اخبار کا کوئی کاغذ لڑھک رہا ہو۔ بولتا تو کتاب کی عبارت اور پہاڑوں کے ہندسوں کے سوا کچھ نہ کہتا۔ لے دے کے ایک ''اچھا جی'' تھا جو ذکرِ حق کی طرح ہر وقت اس کی زبان پر جاری رہتا۔ ڈاکٹر صاحب ایک دن بازار سے اس کے

لیے ایک چھوٹا پیانو خرید کر لائے جو بڑی پیاری آوازیں نکالتا تھا۔اس نے ایک دفعہ ساری سروں کو بجا کر دیکھا اور پھر اسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔کبھی کبھار رحیم بخش اس پیانو کو الماری سے نکال کر اپنے چھوٹے بیٹے کو دیتا جو باورچی خانہ میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اسے بجایا کرتا۔

اکثر دوپہر کو اس کے ابا چارپائی پر لیٹ کر پوچھتے ''کیوں بھئی ہمیں نہیں سناؤ گے اپنا پیانو؟'' تو وہ اچھا جی کہہ کر الماری کھولتا، پیانو نکالتا اور ایک مرتبہ ساری سریں بجا کر پوچھتا بس جی؟'' اور پھر ان کے حکم کے انتظار میں دیر تک وہاں کھڑا رہتا۔

کبھی ڈاکٹر صاحب شام کو اندر سے آواز دے کر پوچھتے۔

''آصف میاں، کیا کر رہے ہو؟''

''جی کھڑا ہوں۔''

''کیوں؟''

''جی رحیم بخش تنور پر روٹی لگوانے گیا ہے جی۔''

''لیکن تم کیوں کھڑے ہو، بیٹا؟''

''جی مجھے رحیم بخش کھڑا کر گیا ہے۔جی باورچی خانہ کے پاس۔''

''اسے کہو دروازہ بھیڑ کر جایا کرے۔''

''اچھا جی۔''

جب وہ چوتھی مرتبہ تختی لکھ رہا ہو تو ڈاکٹر صاحب اندر آ کر کہتے۔''اب بس کرو بیٹا'' تو وہ اچھا جی کہہ کر لکھنا وہیں چھوڑ دیتا۔

سرِ شام اگر کبھی وہ جلد چادر تان کر بستر پر لیٹ جاتا تو ڈاکٹر صاحب پوچھتے۔''ابھی سے کیوں لیٹ گئے، آصف میاں؟''

''جی ایسے ہی۔'' وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

''لیٹے رہو، بیٹا۔''

''اچھا جی۔''

ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دن لوٹا لینے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ پلٹ کر نہیں آئے۔انھوں نے اسلم کو لالچ دیا۔رحیم بخش سے مشورے کیے مگر کوئی بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔آصف کی ہسپتال کی پہلے دن کی زندگی لوٹ کر نہ آسکی۔

اس دوران انھوں نے آصف کو صرف ایک بار کھل کر باتیں کرتے سنا جب ان کے یہاں ایک مشکی گھوڑی نے نیلی آنکھوں والا بلق بچھیرا دیا تھا۔یہ ایک انگریز کی گھوڑی تھی۔جس نے اسے بچہ دینے سے چند روز پہلے ہسپتال میں داخل کروایا تھا۔دوپہر کو لالو جمعدار نے آصف کو بلا کر کہا۔''آؤ میاں جی تمھیں بچھیرا دکھائیں۔''

بچھیرا پیال پڑا تھا۔اس کی ماں منہ میں پڑی ہوئی کرئی چبا رہی تھی اور دم ہلا ہلا کر ایک ضدی مکھی کو اڑا رہی تھی۔بچھیرے کی تھوتھنی

بہت تیکھی تھی۔ کنوتیاں بالکل سیدھی اور گاچیاں اپنی ماں سے دوگنی لمبی تھیں۔ پتلی سی گردن پر کتاب جتنا سیاہ داغ تھا اور ایال روشنائی کی طرح سیاہ تھی۔ پیال کے بہت سے تنکے اس کی ایال میں پھنسے ہوئے تھے۔

آصف نے کہا۔ ''لالو، میں اندر جا کر دیکھوں گا۔''

لالو نے کہا۔ ''ذرا ٹھہرو میاں، میں گھوڑی کے دہانہ ڈال کر اسے دوراسہ باندھ دوں۔''

اندر جا کر لالو نے کنڑی اتار کر دہانہ اس کے منہ میں ڈال دیا اور دائیں بائیں دیواروں میں لٹکتے ہوئے آہنی حلقوں میں اس نے گھوڑی کو دوراسہ باندھ دیا۔ آصف کو اندر آتے دیکھ کر گھوڑی پھنکاری اور اگلے پاؤں سے فرش کھکھوڑنے لگی لیکن آصف ڈرا نہیں۔ وہ بچھیرے کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی ایال سے تنکے چننے لگا۔ جب بچھیرا سانس لیتا تو اس کی ہڈیاں صاف دکھائی دیتی۔ جسم کے بال ریشم ایسے ملائم اور اون کی طرح چمک دار تھے۔ کندھوں کی مچھلیاں خود بخود پھڑک رہی تھیں۔ آنکھیں آسمان ایسی نیلی تھیں اور نرم نرم سم چقندر کے بڑے بڑے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی دم سفید تھی اور پٹھا سیاہ!

آصف نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لالو، یہ بچھیرا میں لوں گا۔ ابا جی سے کہہ کر چھوٹی سی زین بنوالوں گا اور پھر اس پر سوار ہو کر اماں جی کے پاس جایا کروں گا۔۔۔ لیکن میں رہوں گا تھوڑی۔ شام سے پہلے یہاں واپس آ جایا کروں گا۔''

لالو ہنسنے لگا اور بچھیرے کی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میاں، یہ بچھیرا اپنا تھوڑا ہے۔ صاحب کا ہے۔ ہاں ڈاکٹر جی خرید لیں تو پھر اپنا ہو سکتا ہے۔''

''میں ابا جی سے کہوں گا۔ ابا جی مجھے خرید نہ دیں گے؟''

''خرید دیں گے، میاں، پر۔۔۔۔۔''

''پر کیا، لالو؟''

''پر یہی کہ۔۔۔ وہ خریدیں گے۔ خرید کر کیوں نہ دیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب لائی سول کی پچکاری لے کر ادھر آ رہے تھے کہ آصف کو اس طرح بولتے ہوئے ٹھٹک گئے اور جب آصف باہر نکلے گا تو وہ ساتھ کے کمرے میں جہاں ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی بھینس چھت سے لٹک رہی تھی چھپ گئے۔

شام کو انھوں نے صاحب کی بہت خوشامدیں کیں کہ وہ بچھیرا بیچ دیں مگر وہ نہ مانا لیکن اس نے وعدہ کر لیا کہ جب تک بابا لوگ کا دل اس سے بالکل بھر نہ جائے گا وہ بچھیرا لوگ کو گھر نہیں لے جائے گا۔

دوپہر کو جب ڈاکٹر صاحب برآمدے میں لیٹ کر سو جاتے تو آصف چپکے سے اُٹھتا اور بچھیرے کے کمرے میں چلا جاتا۔ اپنے بچے کے ساتھ اس محبت سے پیش آتے دیکھ کر اب گھوڑی بھی آصف سے پیار کرنے لگی تھی۔

وہ اسی جگہ گھنٹہ پھر بیٹھا لالو یا اس کے لڑکے سے گھوڑوں کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ بعض اوقات ڈاکٹر صاحب بیدار ہو کر اُسے کوارٹر میں نہ پاتے تو دبے پاؤں اس کی باتیں سننے مویشی خانے تک چلے جاتے اور دیر تک کھڑے سنتے رہتے لیکن ایک شام یہ جادو بھی

ٹوٹ گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ وہ اتنی ساری باتیں کبھی ان کے ساتھ بھی کرے! جس وقت وہ باورچی خانہ سے چنے کی دال مٹھیاں بھر کر بچھیرے کو کھلانے چلا تو ڈاکٹر صاحب اخبار کی اوٹ میں سے بولے۔ ''بیٹا، چھوٹے بچے دانہ نہیں کھاتے۔''

''اچھا جی۔'' کہہ کر اُس نے دال کنستر میں ڈال دی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر کہا۔ ''جب بڑا ہو جائے گا تو دانہ کھائے گا۔ ابھی تو اپنی ماں کا دودھ ہی پیے گا۔''

''اچھا جی۔''

''تمھیں اچھا لگتا ہے یہ بچھیرا؟'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' وہ ڈر گیا۔

''مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اچھا جی۔''

پھر وہ دبے پاؤں کمرے میں کھسک گیا ور جز دان کھول کر نظم یاد کرنے لگا اور ڈاکٹر صاحب سوچنے لگے۔ ''اگر میں اسے نہ بلاتا تو کتنا اچھا ہوتا اور اگر میں اسے نہ دیکھتا تو اس سے بھی اچھا ہوتا۔'' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آصف نے بچھیرے کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ گھوڑی ہلکی سی آہٹ پا کر سر پھیر کر دروازے میں دیکھنے لگتی اور اس کا بچہ پیال پر لیٹے لیٹے اپنے ساتھی کو یا در کے کنوتیاں گھماتا رہا لیکن آصف اسی چھوٹی سی بوری پر یہی الاپتا رہا ۔

انھوں نے لیے اس کے کپڑے اُتار
کیا گھائل اور آدھ مئوا مار مار

اور جب وہ اتار کہتا تو لمبی لے کے ساتھ اُت عار بن جاتا۔ آج بھی جب بوڑھا اپنے بھتیجے کے بنگلہ سے صبح صبح آصف کی زندگی کے بیمہ کی رقم لینے نکلا تھا تو مالی کی بچی اپنے باغیچے میں پھول چنتے ہوئے اُونچے اُونچے گا رہی تھی:

مسافر غریب ایک رستے میں تھا

اور جب وہ اشعار الاپتی تو اسی طرح اُت عار بن جاتا۔ بوڑھا مالٹے کے پودوں کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا اور جب تک وہ وہاں سے چلی نہ گئی وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اُت عار! اُت عار!

خزانچی نے کہا۔ ''ٹوکن نمبر چوبیس۔ نمبر چوبیس۔۔۔ اگر نمبر چوبیس یہاں ہو تو پے منٹ لے لے بھائی۔''

پھر وہ دوسرا چیک اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

بوڑھے نے واسکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ چوبیس نمبر ٹوکن! اس نے اسے ایک نظر دیکھا، پھر مٹھی میں دبا لیا۔ پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھی اور ٹوکن کو مٹھی میں بھینچے ہوئے بنک سے باہر نکل گیا۔ احاطہ میں آ کر اس نے ہاتھ کو زور سے گھمایا اور مٹھی کھول دی۔ ٹوکن ہوا میں بلند ہوا اور

پھر بنک کی چھت پر جا گرا۔ بنک کے باہر تار گھر کے پاس اسٹیشن جانے والے تانگے کھڑے تھے۔ دو کوچوان بھاگ کر اس کی طرف بڑھے اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ بوڑھے نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی اور جب ایک کوچوان اسے جیت کر لے گیا تو وہ اس کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔

سامنے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی زور زور سے سیٹیاں بجا رہی تھی اور جب اس نے ایک ڈبے کا دروازہ کھول کر قدم اندر رکھا تو گاڑی چل دی۔

دو گھنٹہ بعد اس کا دل سفر سے اکتا گیا اور وہ ایک دیہاتی اسٹیشن پر اتر کھڑا ہوا اور لائن کے ساتھ خاردار تار میں سے گذر کر چھکڑے کی لیک پر چلنے لگا۔ صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے اور شاید کہیں دور بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس نے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیے۔ ایک یکہّ اس کے پاس سے گذرا۔ کوچوان نے پوچھا۔

''بابا۔ بریالہ جا رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''تو آؤ پھر، بارش آ رہی ہے۔ دو روپے دینا۔ راستہ میں بھیگ کر کمبل ہو جاؤ گے۔''

''نہیں میں ایسے ہی پہنچ جاؤں گا۔'' بوڑھے نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔

''لا، بابا، ڈیڑھ روپیہ دے گا۔''

''نہیں، بھائی نہیں، میں تو پیدل ہی آؤں گا۔''

یکے والے نے راسیں گھما کر زور سے گھوڑے کے پیٹ پر ماریں اور اُونچے اُونچے گانے لگا۔ ''دے گیا دوانی کھوٹی، ہو بابا دے گیا دوانی کھوٹی۔ ہو بابا دے گیا۔ ہو بابا دے گیا!''

اُوپر تیرنے والے سیاہ بادل نے زور سے۔ ''بابا! بابا! بابا! کہہ کر اس کا جواب دیا اور چٹاخ پٹاخ کتنی ساری موٹی موٹی بوندیں نیچے آ گریں۔ بوڑھے نے اپنے خاکی اوور کوٹ کے کالر اُوپر اُٹھا لیے اور رفتار ذرا سست کر دی۔ بادل بلبلا کر دھاڑا اور بارش شروع ہو گئی۔ پہلے شرائے دھار بوچھاڑیں آئیں پھر جھما جھم موسلا دھار برسنے لگا۔ بوڑھے کی پگڑی بھیگ کر ڈول کی طرح بھر گئی۔ سفید داڑھی ڈوبی ہوئی بلی کی طرح لٹکنے لگی اور کوٹ غوطہ خوروں کا آہنی لباس بن گیا۔ چپلی بار بار کیچڑ میں پیچھے رہ جاتی اور اس کا ننگا پاؤں آگے جا پڑتا۔ نہر پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسٹیشن غائب ہو چکا تھا اور اس طرف بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔ نہر کے کنارے چھوٹے سے کوارٹر میں بیلدار کی بیوی ہنڈیا بھون رہی تھی۔ چولھے کی روشنی کھڑکی سے باہر نکل کر تھوڑی دور تک اندھیرے کا مقابلہ کرتی اور اس کے بعد معدوم ہو جاتی۔ کوارٹر کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی داڑھی اور آستینوں کو نچوڑا اور پھر چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا بوڑھے جسم میں تیر بن کر اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ پگڈنڈی سیدھی اور گاؤں کا پتہ نہیں کتنی دور۔ کئی بار اس کی پسلیوں میں بلا کا درد اٹھا، کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے، اس کا سانس رک رک گیا اور اس کی نگاہ نے کام کرنا بند کر دیا مگر وہ رکا نہیں۔ ایسے ہی چلتا رہا۔ دو گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد اسے ایک چبوترہ سا نظر

آیا۔بجلی چمکی اوراس نے غور سے دیکھا۔گاؤں کا پنگھٹ تھا۔وہ اس کے پہلو سے ہو کر ایک گلی میں گھس گیا۔اس گلی کے خاتمہ پر ایک کھلا میدان تھا۔تین طرف کچے پکے گھر تھے اور ایک طرف لمبا چوڑا جوہڑ۔کوڑے کے ڈھیر پر سے ہوتے ہوئے وہ ایک بڑے سے احاطہ میں داخل ہو گیا۔نکڑ پر ٹوٹا ہوا چھکڑا اوندھا پڑا تھا۔اس کے سامنے ایک چھپر تلے تنور جل رہا تھا اور چند عورتیں سردی سے ٹھٹھری ہوئی باسی باسی باتیں کر رہی تھیں۔سامنے ایک پکی مستطیل عمارت میں جس کے چاروں طرف کھپریل کا برآمدہ تھا۔الاؤ جل رہا تھا۔ایک آدمی کے اردگرد بہت سے لڑکے بیٹھے جھوم جھوم کر سبق یاد کر رہے تھے۔برآمدے کے ایک ستون سے ڈاک ڈالنے کا ڈھول لٹکا ہوا تھا۔بوڑھا ہولے ہولے قدموں سے ادھر بڑھا اور ایک ستون سے لگ کر نحیف آواز میں بولا۔''ماسٹر جی! میں پڑھا لکھا مہاجر ہوں۔مجھے اپنا ماتحت رکھ لیجیے۔۔۔۔میں بچوں کو بالکل مارتا نہیں!''

اورالاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے سارے بچے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

امّی

وہ بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ خرید رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی ملاقات امّی سے ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے امّی سے آنکھ بچا کر کھسک جانا چاہا لیکن اس کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے اور وہ اپنی پتلون کے جیب میں اکنی کو مسلتا رہ گیا۔ اچانک امّی نے اُسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''او سودی تم کہاں؟''

اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا اور عید کارڈ اُٹھا کر بولا۔ ''یہیں، امّی، میں تو یہیں ہوں۔''

''کب سے؟'' امّی نے حیرت سے پوچھا۔

''تقسیم کے بعد سے امّی میں بھی یہاں ہوں اور ماں اور دوسرے لوگ بھی۔''

''لیکن مجھے تمھارا پتہ کیوں نہ چلا۔ میں نے تمھیں کہیں بھی نہ دیکھا۔''

اس کے جواب میں وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر عید کارڈ کا کنارہ اپنے کھلے ہوئے ہونٹوں پر مارنے لگا۔ دکان کے لڑکے نے بڑے ادب سے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے میز پر پھیلے ہوئے دوسرے کارڈوں میں ڈال کر اندر چلا گیا۔

امّی نے اپنا پرس کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''اب تو تو اپنی ماں سے نہیں جھگڑتا؟''

مسعود شرمندہ ہوگیا۔ اس نے عید کارڈوں پر نگاہیں جما کر کہا۔ ''نہیں تو۔۔۔ میں پہلے بھی اس سے کب جھگڑتا تھا۔''

امّی نے کہا۔ ''یوں مت کہہ۔ پہلے تو تُو بات بات پر اس کی جان کھا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فساد برپا کر دیتا تھا۔''

اس نے صفائی کے طور پر امّی کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا۔ جب تو میں چھوٹا سا تھا، امّی۔ اب تو وہ بات نہیں رہی نا۔''

لیکن اس جواب سے امّی کو تسلی نہ ہوئی اور اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''تیرا دوست تو یو۔ کے چلا گیا انجیرنگ کی تعلیم پانے۔ یہ عید کارڈ اسی کے لیے خرید رہی تھی۔''

''کہاں؟ انگلینڈ چلا گیا! اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''جبھی تو وہ مجھ سے ملا نہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا۔ اسے ہوا کیا۔ یہاں ہوتا اور مجھ نہ ملتا۔ کیسی حیرانی کی بات ہے۔''

امّی نے آہستہ سے دہرایا۔ ''ہاں انگلینڈ چلا گیا۔ ابھی دو سال اور وہیں رہے گا۔ یہ عید کارڈ اسی کے لیے خریدا ہے۔'' اور اس نے کارڈ آگے بڑھا دیا۔ اس پر غریب الوطنی، دوری اور ہجر کے دو تین اشعار لکھے تھے۔

مسعود نے اُسے ہاتھ میں لیے بغیر کہا۔ ''لیکن یہ عید تک اسے کیسے مل سکے گا۔ عید تو بہت قریب ہے۔''

امّی نے وثوق سے کہا۔ ''ملے گا کیسے نہیں۔ میں بائی ایر میل جو بھیج رہی ہوں۔''

لیکن بائی ایئر میل بھی یہ وقت پر نہ پہنچ سکے گا۔ مسعود نے جواب دیا۔

امّی نے کہا۔ ''تو کیا ہے۔ اسے مل تو جائے گا۔ ایک آدھ دن لیٹ سہی۔''

اور مسعود کے کچھ کہنے سے پیشتر امّی نے کہا۔ ''کبھی ہمارے گھر تو آنا۔ تمھاری دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا ہے۔ ضرور

آنا۔عید پر چلے آنا۔ہم اکھٹے عید منائیں گے۔''

جب امّی مسعود کو اپنا پتہ لکھا کر چلنے لگی تو اس نے اپنا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا۔''آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر لینا۔میں اکثر دورے پر رہتی ہوں لیکن عید کے روز میں ضرور گھر پر ہوں گی۔''

مسعود نے پتے کے ساتھ ایک کونے پر فون نمبر بھی لکھ لیا۔امّی نے ایک مرتبہ پھر اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا اور اپنی ساڑھی کا پلّو درست کرتے ہوئے دکان سے نیچے اُتر گئی۔مسعود نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اکنی کو چٹکی میں پکڑ لیا اور بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ انتخاب کرنے لگا۔

مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔اوّل اوّل تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی۔لیکن اپنے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اُسے مسعود کو تقریباً بھلا ہی دینا پڑا۔مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جب مسعود کو اپنے چچا سے فیس مانگنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کئی دن یونہی ٹال مٹول میں گذار دیتا۔پیسوں کے معاملے میں اس کی ماں بالکل معذور تھی۔گھر کے معمولی اخراجات تک کے لیے اُسے اپنے خاوند کو منہ تکتے رہنا پڑتا اور وہ اپنی گم مائیگی اور تہی دستی کا غصہ مسعود پر اتارا کرتی۔ہر صبح اُسے چولھے کے پاس بیٹھ کر چائے کی پیالی اور رات کی ایک باسی روٹی کے ساتھ یہ فقرہ ضرور سننا پڑتا۔''لے مرلے، تیری خاطر مجھے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔'' یہ جملہ گو مسعود کو نہایت ہی ناگوار گزرتا۔لیکن ہر روز ناشتے کے لیے یہ بل کچھ ایسا بڑا بھی نہ تھا اور فیس ادا کرنے کے دن تو اس بل میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا۔اس کا چچا حقہ پیتے ہوئے کہتا۔''پڑھتا وڑھتا تو ہے نہیں۔یونہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔میں نے تیری ماں سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ تجھے ڈاکٹر بیگ کے یہاں بٹھا دیں تا کہ کچھ کمپاونڈری کا کام ہی سیکھ لے۔آگے چل کر تیرے کام آئے گا۔لیکن پتہ نہیں وہ کن خیالوں میں ہے۔''مسعود دونوں باہیں سینے کے ساتھ لگا کر آہستہ سے جواب دیتا۔''کام تو اچھا ہے جی۔لیکن پہلے دسویں پاس کر لوں پھر۔۔۔۔۔۔''

اور چچا صاحب طنز سے مسکرا کر ایک باچھ ٹیڑھی کر کے بیچ میں بول اٹھتے۔''بس بس جیسی کو کو ویسے بچے! یہی بات تیری ماں کہا کرتی ہے۔اسے جب معلوم ہوا گر خود کما کر تیری روز روز کی فیسوں کی چٹی بھرے۔کتنی فیس ہے تیری؟''

مسعود ذرا سہم کر جواب دیتا۔''چار روپے تیرہ آنے جی۔''

''اچھا اس مرتبہ تیرہ آنے کا اضافہ ہو گیا۔''

''کھیلوں کا چندہ ہے جی۔ماسٹر جی نے کہا تھا کہ۔۔۔۔۔''

''تو کہہ دے اپنے ماسٹر واسٹر سے کہ میں کھیل نہیں کھیلتا اور تجھے شرم نہیں آتی کھیلیں کھیلتے ہوئے۔اونٹ کی دم چومنے جتنا ہو گیا ہے اور کھیلیں کھیلتا ہے۔''

مسعود آہستہ سے کھنکار کر جواب دیتا۔''میں تو کچھ نہیں کھیلتا جی پر ماسٹر جی کہتے ہیں کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دینا پڑے گا۔''

''یہ اچھا رواج ہے۔'' اس کا چچا سر ہلا کر کہتا۔ ''کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دو۔ سکول ہے کہ کمشنر کا دفتر۔ چندہ نہ ہوا دار فنڈ ہوا۔''

چونکہ عام طور پر ایسی بات کا جواب مسعود کے پاس نہ ہوتا۔ اس لیے وہ خاموش ہی رہتا۔ اس کے بعد اس کا چچا پاس ہی کھونٹی پر لٹکتی ہوئی اچکن سے پانچ کا نوٹ نکال کر کہتا۔ ''لے پکڑ۔ اپنی ماں کو بتا دینا اور سکول سے لوٹتے ہوئے باقی کے تین آنے مجھے دفتر دے جانا۔''

خوف، نفرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتیں اور وہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی چل پڑتا اور اس کا چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہوئے ہانک لگاتا۔ ''فیس دے دی ہے جی تمھارے شہزادے کو۔ ڈپٹی صاحب کو!'' یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وہ اُلٹے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گر چکی تھی اور وہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ اپنی ماں کو گالی دے کر چکایا کرتا۔

تفریح کی گھنٹی میں درختوں کے سائے تلے اپنے کھیلتے ہوئے ہم جولیوں کی دعوت سے انکار کر کے اسے سیدھا گھر بھاگنا پڑتا۔ خاصہ دان تیار ہوتا جسے اٹھا کر وہ جلدی جلدی اپنے چچا کے دفتر پہنچتا اور اسے ان کی کرسی کے پاس رکھ کر بغیر کچھ کہے سکول بھاگ آتا۔ عرصہ سے اس کی تفریحی گھنٹیاں یونہی ضائع ہو رہی تھیں۔ صرف اتوار کے دن اسے اپنے چچا کے دفتر نہ جانا پڑتا۔ لیکن اتوار کو کوئی تفریح کی گھنٹی نہیں ہوتی۔

آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان سے پہلے اس کے یہاں ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا۔ جس کا نام اس کی ماں کے اصرار کے باوجود مقصود کے بجائے نصر اللہ رکھا گیا۔ اس بھائی کی پیدائش نے مسعود سے اس کی ماں کو قطعی طور پر چھین لیا اور اس کی حیثیت گھر میں کام کرنے والے نوکر کی سی ہو کر رہ گئی جو اپنا اصلی کام ختم کرنے کے بعد پڑوس کے دروازے کی اونچی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بچّے کھلایا کرتا ہے۔ نصر اللہ کی آمد کے دن سے مسعود کا چچا دن میں بار بار ڈاکٹر بیگ کا وظیفہ کرنے لگا اور مسعود کی ماں سے تقاضا کرتا رہا کہ چونکہ نصر اللہ ہو گیا ہے اس کے اخراجات بھی ہونگے اس لیے مسعود کو سکول سے اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں بٹھا دینا چاہیے لیکن اس کی ماں نہ مانی اور سلسلہ یونہی چلتا رہا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مسعود کے سکول میں موسم کے طلسمی کارڈ بیچنے ایک آدمی آیا اور اس کی وجہ سے مسعود کی ملاقات امّی سے ہوئی۔ گلریز اپنی بیوہ امّی کا ایک ہی لڑکا تھا اور مسعود کا ہم جماعت تھا۔ جماعت بھر میں مسعود کی دوستی صرف گل ریز سے تھی۔ دونوں کو ننھی ننھی ٹوکریاں بنانے کا خبط تھا۔ پڑھائی کے دوران میں اگر کبھی انھیں فرصت کے چند لمحات میسّر آ جاتے تو وہ سائنس روم کے دروازوں سے چمٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں سے ادھ سُوکھی رگیں توڑتے اور کھیل کے میدان میں ہری ہری گھاس پر ٹوکریاں بنانے لگتے۔ جس میں گلاب کا ایک پھول یا چنبیلی کی چند کلیاں مشکل سے سما سکتیں۔ مسعود دستی والی ٹوکری بھی بنا لیتا تھا۔ لیکن گل ریز سے ہزار کوششوں کے باوجود بھی ایسی ٹوکری نہ بن سکتی تھی اور وہ مسعود کی بنائی ہوئی ٹوکری لے لیا کرتا۔ ہاں تو جس دن ان کے سکول میں طلسماتی کارڈ بیچنے والا آدمی آیا

مسعود کی ملاقات امّی سے ہوئی۔ سفید کارڈوں کے بیچوں بیچ گلابی رنگ کا ایک بڑا سا سرخ دائرہ تھا جس پر ایک خاص مصالحہ لگا ہوا تھا! کارڈ بیچنے والے نے بتایا کہ جیسے جیسے موسم تبدیل ہوتا رہے گا اس دائرے کے رنگ بھی بدلتے رہیں گے۔ جوں جوں گرمی بڑھتی جائے گی گلابی دائرہ سرخ ہوتا جائے گا اور جب سردی کا زور ہوگا تو یہ گلابی چکر بسنتی رنگ کا ہو جائے گا اور جس دن مطلع ابر آلود ہوگا اور بارش برسنے کا امکان ہوگا تو یہ چکر خود بخود دھانی رنگ کا ہو جائے گا۔ کارڈ کی قیمت دو آنے تھی۔ کلاس میں تقریباً سب نے وہ کارڈ خریدے اور جن کے پاس دو آنے نہ تھے انھوں نے بات اگلے دن پر اُٹھا دی۔

گھر سے خاصہ دان اُٹھاتے ہوئے مسعود نے ہولے سے کہا۔ ''اماں، مجھے دو آنے تو دو میں۔۔۔۔۔۔''

مگر اس نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کہاں ہیں دو آنے۔ کبھی مجھے پیسے چھوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ کون لالا کے میری جھولیاں بھرتا ہے جو تجھے دونی دوں۔''

مسعود نے مایوس ہو کر خاصہ دان اُٹھا لیا اور چپ چاپ دور وازے سے باہر نکل گیا۔۔۔ دفتر پہنچ کر اس نے خاصہ دان کرسی کے پاس رکھ دیا اور خلاف معمول وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چچا نے فائل میں کاغذ پروتے ہوئے عینک کے اوپر سے دیکھا اور ترشرو ہو کر پوچھا۔ ''کیوں؟ کھڑا کیوں ہے؟''

''کچھ نہیں جی۔'' مسعود کا گلا خشک ہو گیا۔

''کچھ تو ہے۔''

''نہیں جی کچھ بھی نہیں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''تو پھر فوجیں کھڑی کیوں ہیں؟''

''جی ایک دونی چاہیے۔۔۔ اماں۔۔۔ میں۔۔۔ سکول میں جی۔۔۔۔۔'' ''ہوں ماں'' اس کے چچا نے غرا کر کہا۔ ''تجھے دونی دوں! تجھے ناداں دوں! میرے بورے جو ڈھوتا رہا ہے۔ میرے ساتھ جو کھیلتا رہا ہے۔''

مسعود شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں میں۔۔۔ اماں نے۔۔۔۔۔ اماں نے۔۔۔۔۔ جی سکول۔۔۔۔۔ سکول میں۔۔۔۔۔''

''ہوں'' اس کے چچا نے کھرج میں کہا۔ ''تجھے پیسے دوں! تجھے دونیاں دوں۔ کیوں؟ مجھے بین سناتا رہا ہے۔ مجھے نبض دکھاتا رہا ہے۔ تجھے پیسے دوں ہوں تجھے دونی دوں۔۔۔۔ تجھے۔۔۔۔۔''

مسعود نے ایک نگاہ خاصہ دان کو غور سے دیکھا جو واقعی اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا اور پھر اپنے چچا کو اسی طرح ہوں ہوں کرتے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کھپریل کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا چپڑاسی آپ ہی آپ کہے جا رہا ہوں۔ ''ہوں! تجھے پیسے دوں! تجھے ناداں دوں۔ میرے بورے ڈھوتا رہا ہے۔ ہوں تجھے پیسے دوں۔''

اور راستہ بھر مسعود کو ایسی ہی آوازیں آتی رہیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے ٹخنوں کے درمیان چھوٹا سا گراموفون لگا ہوا

ہوا اور جس کا ریکارڈ اس کی رفتار کے مطابق گھومتا ہو۔ مسعود نے سڑک کے کنارے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا اور ریکارڈ اُونچے اُونچے بجنے لگا۔ ''تجھے پیسے دوں، تجھے پیسے دوں۔ میرے بورے جو۔ میرے بورے جو۔'' مسعود نے گھبرا کر راہ چلتے لوگوں کو غور سے دیکھا کہ کہیں وہ بھی تو یہ ریکارڈ نہیں سن رہے اور پھر اپنی رفتار بالکل سست کر دی۔ گراموفون کی چابی ختم ہوگئی اور ریکارڈ سسکنے لگا۔ ''تجھے پیسے ۔۔۔۔۔دوں۔۔۔تجھے ناداں۔۔۔۔۔دوں۔۔۔۔میرے۔۔۔۔۔بورے۔۔۔جو۔۔۔۔۔'' اور سکول تک یہ باجا یونہی بجتا رہا۔

سکول بند ہونے پر گل ریز نے خود ہی اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی کہ طلسماتی کارڈ اپنے کمرے میں لٹکا کر اور سارے دروازے بند کر کے دیکھیں گے کہ گرمی سے دائرہ سرخ ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ تجسس مسعود کو کشاں کشاں ان کے گھر لے گیا۔ گول گول غلام گردش والے برآمدے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی ساڑھی باندھے ادھیڑ عمر کی ایک دبلی سی عورت جالی کے دروازے کو دھاگے سے ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا اور کندھوں پر سلیٹی رنگ کی بنی ہوئی ایک اونی شال پڑی تھی۔ مسعود نے ایک نظر اس کے ننھے سے وجود کو دیکھا جس سے سارا برآمدہ بھرا بھرا معلوم ہوتا اور سیڑھیوں پر ٹھٹک گیا۔ اسے اس طرح دم بخود دیکھ کر گل ریز نے بے تکلفی سے بستہ چارپائی پر پھینک کر کہا۔ ''آؤ۔ آؤ'' اور پھر سیمنٹ کے فرش پر تیزی سے اپنے بوٹ گھسیٹتا وہ اس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلا کر کہنے لگا۔ ''امّی، امّی! میں نے ایک چیز خریدی۔ ایک نئی چیز، جادو کا کارڈ۔۔۔ دیکھو امی۔'' اور اس کی امی نے گردن موڑ کر اور کارڈ ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''اچھا ہے۔ بڑا اچھا۔'' اور پھر اس کی نگاہیں برآمدے میں رینگتے ہوئے اس لڑکے پر پڑیں۔ جس نے ٹخنوں سے اُونچی میلی شلوار پہن رکھی تھی اور جس کے خاکی کینوس کے جوتوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گلریز نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا دوست مسعود ہے۔ امی۔ یہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ یہ میرے ساتھ اس کارڈ کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھنے آیا ہے۔''

امّی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے غور سے مسعود کو دیکھا۔ خوش آمدید کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ بڑے پیار سے بولی۔ ''تم نے کارڈ نہیں خریدا، مسعود؟''

اور مسعود کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی برسوں کی واقف ہو۔ مسعود اس کے صحن میں کھیل کر اتنا بڑا ہوا ہو اور وہ مسعود کو لمبی لمبی کہانیاں سنا کر ہر رات کہا کرتی رہی ہو۔ ''اب تم سو جاؤ۔''

گلریز نے اپنے کارڈ کے دائرے پر فخر سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے نہیں خریدا، امی۔ اس کے پاس دونی نہیں تھی۔ اس کے پاس کبھی بھی پیسے نہیں ہوئے۔''

امی نے کہا۔ ''تو اچھا دوست ہے۔ اس نے نہیں خریدا تو تو نے دو کارڈ کیوں نہ خرید لیے؟ تیرے پاس تو پیسے تھے۔''

گلریز نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''باقی پیسوں کی تو میں نے برفی کھالی تھی اور ایک آنے کی پنسل خریدی تھی۔

امی نے کہا۔ ''تو تجھے اپنے دوست سے برفی پیاری ہے۔''

''نہیں جی، امّی! گلریز شرمندہ ہوگیا اور اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ کے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں سرخ رنگ کے صوفے پر ایک لڑکی سویٹر بن رہی تھی۔ اس کے پہلو میں چینی کی ایک چھوٹی سی رکابی میں کھیلیں پڑی تھیں۔ گلریز نے اندر داخل ہو کر

کہا۔ ''دیکھو دیدی، دیکھو۔ میرے پاس جادو کا کارڈ ہے۔''

اور دیدی نے سلائیوں سے نگاہیں اُٹھائے بغیر کہا۔ ''اچھا ہے''

مسعود دیدی کا رویہ دیکھ کر اور باادب ہو گیا اور گلریز خفیف ہو کر جالی کا دروازہ زور سے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ دیدی نے ماتھا سکیڑ کر کہا۔ ''آہستہ۔'' اور پھر سوالیہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ مسعود نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہولے سے آگے بڑھا۔ دھیرے سا جالی کا دروازہ کھولا اور اسے بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ بند کرتے ہوئے گلریز کے پیچھے چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر گلریز نے کارڈ میز پر ڈال کر کہا۔ ''دروازہ بند کر دو یار کمرہ گرم ہو جائے گا تو کارڈ کا رنگ بدلے گا۔''

دروازہ بند ہو گیا۔ وہ دیر تک کارڈ پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے مگر اس کا رنگ تبدیل نہ ہوا۔ مسعود نے کہا۔ ''گلریز میاں، گرمی کم ہے۔ اس لیے رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔ باورچی خانے میں چولھے کے پاس کارڈ رکھیں گے تو یہ ضرور سرخ ہو جائے گا۔''

جب باورچی خانے میں پہنچے تو امی گوبھی کاٹ رہی تھیں۔ گلریز نے ایک چوکی چولھے کے پاس کھینچ کر اس پر کارڈ ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رنگ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا۔

امی سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ اسے پھلوں اور بسکٹوں والی چائے پلا کر گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں تو باورچی خانے سے چرائی ہوئی چونی مسعود کی جیب میں انگارے کی طرح دہکنے لگی اور وہ جلدی سے سلام کر کے ان کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس دن کے بعد امی نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور سارا سارا دن ان کے گھر ہی میں رہنے لگا۔

تقسیم کے بعد جہاں سب لوگ تتر بتر ہو گئے وہاں امی اور مسعود بھی بچھڑ گئے اور پورے تین سال بعد آج ان کی ملاقات عید کارڈوں کی دکان پر ہوئی تھی۔

مسعود نے اپنی کوٹھڑی تو نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ دفتر کے بعد کا تقریباً سارا وقت امی کے یہاں گذارنے لگا۔ دیدی نے واقعی ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ متکبر ہو گئی تھی۔ بریکٹ پر ایک بڑے سے پھول دان میں وہ سرکنڈوں کے پھول لگائے موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی۔ اس کی آواز جو پہلے نرگس کے ڈنٹھل کی طرح ملائم تھی خشک اور کھردری ہو گئی تھی۔ یوں تو وہ دن بھر میں مشکل سے ہی چند جملے بولتی لیکن جب بات کرتی تو یوں لگتا گویا خشک سفنج کے ٹکڑے اگل رہی ہو۔ امی جب بھی اس سے بات کرتی بڑے ادب اور رکھ رکھاؤ سے کام لے کر۔ واقعی دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا۔

امی نے کئی مرتبہ مسعود سے اس کی اماں اور چچا کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ۔ ''یہیں کہیں رہتے ہیں۔ مجھے علم نہیں۔''

دفتر سے فارغ ہو کر مسعود سیدھا امی کے یہاں پہنچتا اور رات کو دیر تک ادھر ادھر بے معنی گپیں ہانکتا رہتا۔ دیدی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔ وہ دو تین مرتبہ تیز تیز نگاہوں سے امی اور مسعود کو گھورتی اور پھر ٹھپ سے کتاب بند کر کے اندر کمرے میں چلی جاتی۔ جب دیدی مسعود کی پہنچ سے باہر ہو جاتی تو وہ زور زور سے قہقہے لگا کر اس کی پڑھائی میں مخل ہونے لگتا۔ امّی کو پتہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر دیدی کو

تنگ کر رہا ہے لیکن اس نے کبھی بھی مسعود کو منع نہیں کیا۔ ایک رات جب اسے باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہوگئی تو امی نے کہا۔ ''اب یہیں سو رہو۔ اس وقت اتنی دور کہاں جاؤ گے۔'' تو مسعود وہیں سو رہا اور اس رات کے بعد وہ مستقل طور پر اسی کے یہاں رہنے لگا۔

چچا کی بخیل فطرت اور اماں کی لاپروائی اس کی آزادانہ زندگی پر ایک عجیب طرح سے اثر انداز ہوئی۔ وہ پہلے جس قدر گم سم رہتا تھا اب اسی قدر ہنسوڑ ہو گیا تھا اور اپنے بچپن کے غریبی کا مداوا کرنے کے لیے اس نے جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی وہ تنگ و تاریک کوچوں میں سے گزرتا ہوا اس اندھی گلی میں پہنچ جاتا جس کے آخر میں پرانے چھپر اور پھونس کے ڈھیر پڑے ہوتے۔ پھونس کو ایک طرف ہٹا کر مسعود اندھیرے بھٹ میں داخل ہوتا۔ جس کے پیچھے کچی اینٹوں کی ایک غلیظ سی کوٹھڑی کڑوے تیل کا دیا اپنے آغوش میں لیے اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ چیتو، بھمیری اور ڈھلن نشہ پانی کیے فرش پر لیٹے ہوتے اور ریباں چھوٹے سے دروازے کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے پشت لگائے ہولے سے کہتی۔ ''آ گیا، راجہ نل آ گیا۔'' اور پریل شروع ہو جاتی۔ مسعود کا ذہن اور مقدر مل جل کر ایسے ایسے معرکے مارتے کہ ہارنے کی نوبت کم ہی آتی اور جب تک مسعود کی جیبیں بالکل خالی نہ ہو جاتیں اسے کل نہ پڑتی۔ وہ تاش پھینٹے جاتا۔ نقدی کی ڈھیریاں لگائے جاتا اور پریل کھیلے جاتا حتیٰ کہ اس کے مخالفوں کے پاس ایک چھدام بھی نہ رہتا یا اس کی جیبوں کا استر مردہ گائے کی زبان کی طرح باہر لٹکنے لگتا۔

امّی کو پتہ تھا کہ مسعود نوکر ہو کر بڑا ہی زندہ دل اور چست ہو گیا ہے لیکن اس بات کا علم نہ تھا کہ پریل کھیلتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی قینچی کی طرح چلنے لگی ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو امی اس کا بستر بچھا کر آدھی رات تک اس کا انتظار کرتے ہوئے سوچا کرتی کہ گل ریز بھی یونہی آوارہ گردی کرتا ہوگا اور اس کی لینڈ لیڈی اس کا انتظار اسی طرح کیا کرتی ہوگی۔ پھر مسعود اور گل ریز آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے۔ امّی اور لینڈ لیڈی ایک دوسری میں مدغم ہو جاتیں اور شفقت لاابالی کا انتظار کرنے لگتی۔ دیدی اپنے بستر پر ایک دو مصنوعی کروٹیں بدل کر آتش بار نگاہوں سے امی کو گھورتی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے دم سادھ لیتی۔

مسعود جب پھاٹک کے قریب پہنچتا تو پنجوں کے بل چلنے لگتا، شور مچانے والے پٹ کو آہستہ سے دھکیلتا اور پھر اندر داخل ہو کر اسے اسی طرح بند کرنے لگتا کہ امی پکار کر پوچھتی۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''کہیں سے نہیں امی۔'' وہ سہم جاتا۔

''تو تم یہیں تھے؟'' امی غصے سے پوچھتی۔

''نہر پر دوستوں کے ساتھ گپیں مار رہا تھا۔''

''یہ تمھارے کون سے ایسے دوست ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔''

''میرے دفتر کے ساتھی ہیں۔ امی۔ دفتر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور وہ آرام سے آ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور اپنے بوٹ کھولنے لگتا۔ امی خاموشی سے اُٹھ کر اندر آ جاتی اور کٹ کیٹ کا پیکٹ اس کے بستر پر پھینک کر بے پروائی سے کہتی۔ ''میں آج بازار گئی تھی اور تیرے

لیے یہ لائی تھی۔ آدھی اپنی دیدی کے لیے رکھ لینا۔''

اور جب وہ بستر پر لیٹنے لگتا تو امی کہتی۔ ''یہ تو اپنے بالوں میں اتنا تیل کیوں تھوپ لیتا ہے۔ لے کے سارے تکیے تیلی کی صدری بنا دیے ہیں۔ صبح ہونے دے، تیرے سر پر استرا پھروا تی ہوں۔''

اور مسعود کوئی جواب دیے بغیر سفید چادر اوڑھ کر مردے کی طرح سیدھا شہتیر لیٹ جاتا تو امی جل کر کہتی۔ ''تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے یوں نہ لیٹا کر۔ یا تو کروٹ بدل یا ٹانگوں میں خم ڈال۔ اس طرح لیٹنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

مسعود کروٹ بدل کر سو جاتا اور لینڈ لیڈی اطمینان کی سانس لے کر لباس تبدیل کرنے چلی جاتی۔

امی گلریز کا ہر خط مسعود کو ضرور دکھاتی اور پھر اتنی مرتبہ اس سے پڑھوا کر سنتی کہ مسعود کو الجھن ہونے لگتی اور وہ خط پھینک کر باہر چلا جاتا۔ گلریز کے ہر خط میں یا تو روپوں کا مطالبہ ہوتا یا گرم کپڑوں ور دیگر معمولی چیزوں کا جن کا بندوبست امی بڑے انہماک سے کیا کرتی۔ پارسل سیے جاتے۔ ان پر لاکھ کی مہریں لگتیں اور پھر مسعود کو انھیں ڈاک خانے لے جانا پڑتا۔

تنخواہ ملنے میں ابھی کئی دن پڑے تھے۔ بھمبیری مسعود کو سڑک پر مل گیا۔ اس نے بتایا کہ ان کی چوکڑی میں ایک بڑا مال دار کباڑیا رکنا داخل ہو گیا ہے جو صرف ہزاروں کی بازی لگاتا ہے۔ مسعود کے استفسار پر بھمبیری نے بتایا کہ وہ ہر روز اپنے ایک گماشتے لالو کانے کے ساتھ گپھا میں آجاتا ہے اور نشہ پانی کر کے چلا جاتا ہے۔ مسعود نے ڈاک خانے کے پچھواڑے جا کر گرم سوٹ کا پارسل کھولا اور ماسٹر غلام حسین کی دکان پر جا کر ڈیڑھ سو روپے کا بیچ دیا۔ اس رات وہ گھر نہیں گیا۔ اس کا بستر تمام رات ٹھنڈا رہا اور اس کی پائنتی پر پڑی ہوئی سفید چادر امی کی طرح ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی۔ صبح جب وہ گھر پہنچا تو نہ اس کے پاس روپے تھے اور نہ پارسل کی رسید۔ امی نے رات بھر غائب رہنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیے بغیر اس سے پوچھا۔ ''پارسل کروا دیا تھا۔؟''

''کروا دیا تھا۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''اور رسید؟'' دیدی نے پوچھا۔

مسعود نے گھور کر دیدی کو دیکھا اور کہا۔ ''رات میں جس دوست کے یہاں سویا تھا رسید وہیں رہ گئی۔''

امی نے چائے کی پیالی بناتے ہوئے پوچھا۔ ''چھ روپے میں کام بن گیا تھا؟''

''نہیں'' مسعود نے آہستہ سے کہا۔ ''ساڑھے سات روپے کے ٹکٹ لگے۔ میں نے ڈیڑھ روپیہ ادھار لے لیا تھا۔ اور ڈیڑھ کا لفظ آتے ہی چائے اس کے حلق میں پھنس گئی۔

مسعود کو معلوم تھا کہ امی کی تنخواہ تین چار سو کے لگ بھگ ہے۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ایک پارسل نہ پہنچنے سے وہ مر نہیں جائے گی۔

ایک دن جب دیدی کے ڈریسنگ ٹیبل سے پچیس روپے گم ہو گئے تو اس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے امی سے کہہ دیا کہ یہ کارستانی مسعود کی ہے۔ امی بجائے خفا ہونے کے رو کر کہنے لگی۔ ''آج تو مسعود پر الزام دھرتی ہے کل مجھے چور بتائے

گی۔۔۔۔۔بھلا وہ تیرے پیسوں کا بھوکا ہے؟''

لیکن دیدی نہ مانی اور ماں بیٹی میں خوب خوب تکرار ہوئی۔شام کو نہ امی نے کھانا کھایا اور نہ دیدی نے۔لیکن اس رات مسعود کا پانسہ بھاری رہا اور اس نے اپنے ساتھ ھمبیری اور چیتو کو بھی نان کباب کھلائے۔

گلریز کا خط آ گیا تھا کہ اسے پارسل نہیں ملا۔ڈاک خانے میں پوچھ گچھ ہوئی۔رسید کی ڈھنڈیا پڑی لیکن نہ رسید ملی نہ پارسل کا پتہ چلا اور امی ڈاکخانے کو روپیٹ کر خاموش ہو رہی۔لیکن اس مرتبہ نہ تو اس نے گلریز کا خط مسعود کو دکھایا اور نہ ہی اس سے پڑھوا کر سنا۔اس نئے رویے نے مسعود کو یونہی تجسس میں ڈال دیا۔اس نے ایک دو مرتبہ امی سے خط کے بارے میں پوچھا بھی لیکن وہ یہی کہہ کر خاموش ہو گئی کہ''میں کہیں ڈال کر بھول گئی ہوں۔''خط گھر ہی میں تو تھا۔جاتا کہاں ،مسعود کی تفتیش نے اسے امی کی میز سے ڈھونڈ نکالا۔گل ریز نے لکھا تھا۔''پارسل مجھے نہیں ملا۔پتہ نہیں کیا بات ہے۔یہاں سردی بڑھتی جا رہی ہے اور میں سخت پریشان ہوں۔لیکن سب سے بڑی پریشانی روپے کی ہے۔مجھے نئی کلاس میں داخلہ لینا ہے جس کے لیے مجھے کم از کم دو ہزار روپوں کی ضرورت ہو گی۔لیکن امی تم یہ دو ہزار روپیہ کہاں سے لاؤ گی۔مجھے علم ہے تمھارے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔پر میں کروں بھی تو کیا!تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک ہی ڈگری لے کر آ جاؤں؟''۔۔۔۔۔۔۔

اس کے آگے مسعود نے کچھ نہ پڑھا۔خط تہ کیا اور دراز میں رکھ کر دفتر چلا آیا۔اسے امی کی تنخواہ کے بارے میں علم تھا اور اس کے اندوختہ کے متعلق بھی اندازہ تھا لیکن گل ریز کے اس خط نے اس کے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا۔سارا دن وہ بے شمار ننھے ننھے سوالوں میں گھرا ٹائپ کرتا رہا اور آخر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ امی نے گلریز کو بھی دھوکہ میں رکھ چھوڑا ہے تا کہ وہ غیر ملک میں عیاشیوں پر نہ اتر آئے۔شام کو وہ معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا۔پھاٹک پر تانگہ کھڑا تھا۔دیدی کہیں باہر گئی ہوئی تھی اور می اندر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔مسعود دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔امی اپنے بڑے سیاہ ٹرنک سے زیور نکال نکال کر انھیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اپنے پرس میں ڈالے جاتی۔ٹرنک بند کر کے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے سنہری انگوٹھی اتار کر بھی اسی پرس میں ڈال لی۔جب وہ اُٹھ کر چلنے لگی تو مسعود نے اندر داخل ہو کر کہا۔''کہاں کی تیاری ہے؟''

امی گھبرا گئی۔اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے کہا۔''اچھا ہی ہوا تم آ گئے۔میں بازار جا رہی تھی۔تھوڑا سا کپڑا خریدنا ہے۔تم گھر پر ہی رہنا تمھارے لیے کٹ کیٹ لاؤں گی۔''

مسعود نے کہا۔''امی ہمیں تو آج اس لیے جلدی چھٹی ہو گئی ہے کہ ہمارے دفتر کی ٹیم ریلوے کلب سے فٹبال کھیل رہی ہے اور میں چھاؤنی جا رہا ہوں۔میں گھر پر رہ کر کیا کروں گا۔دینو جو یہاں موجود ہے۔''

امی نے کہا۔''اس میں ساتھ لیے جا رہی تھی۔لیکن خیر اب وہی گھر پر رہے گا۔

۔۔۔تم چائے پی لینا۔تمھارے لیے انڈے ابال کر میں نے تھرموس میں رکھ دیے ہیں۔''

امی چلی گئی۔مسعود نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود کرسی پر دراز ہو کر اخبار پڑھنے لگا۔دینو چائے تپائی پر رکھ کر تمبا کو لینے

چلا گیا۔ مسعود نے اسی طرح اخبار گود میں ڈالے ایک پیالی پی۔ تھرموس کھول کر ایک انڈا نکالا اور بغیر نمک لگائے کھا گیا۔۔۔۔۔ دینو کو بازار گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کے لوٹ آنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ مسعود اُٹھا۔ دیدی کے ٹرنک سے کروشیا نکالا اور امی کے کمرے میں جا کر اٹیچی کیس کھولنے لگا۔ اوپر ہی قرمزی رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی کہ تہہ سے پچاس روپے پڑے تھے۔ روپے اُٹھا کر اس نے جیب میں رکھ لیے اور پھر تالا بند کرنے لگا۔ لیکن زنگ آلود پھاٹک کے کھلنے سے وہ چونک پڑا اور گھبراہٹ میں کروشیا بھی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔ مسعود نے دینو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنی دیر کہاں کر دی۔ کہاں چلا گیا تھا؟''

''جانا کہاں تھا۔'' دینو نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ''بنا بنایا تمبا کو دکاندار کے پاس تھا نہیں۔ میں اگلی دکان پر گڑ لینے چلا گیا۔''

''اچھا'' مسعود نے بے پروائی سے کہا۔ ''امی سے کہہ دینا میں ذرا دیر سے آؤں گا اور کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

یہ کہہ کر مسعود چلا گیا اور دینو نے پھاٹک بند کر دیا۔

سپرنٹنڈنٹ کے یہاں پہنچ کر مسعود نے اپنے چہرے پر مسکینی کے ایسے آثار پیدا کر لیے کہ وہ پسیج کر رہ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر ڈیڑھ سو روپیہ لا کر مسعود کو دے دیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ''مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ دو سو روپے اس وقت میرے پاس نہیں۔ شاید یہ رقم تمھاری والدہ کو موت کے منہ سے بچا سکے۔'' اور جب مسعود اُٹھ کر جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''جنرل وارڈ کے انچارج ڈاکٹر قدیر میرے واقف ہیں۔ کہو تو انھیں ایک رقعہ لکھ دوں۔''

مسعود نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا کر دیجیے تو میری دنیا بن جائے گی۔ خواجہ صاحب، میرا اس جہاں میں سوائے میری ماں کے اور کوئی نہیں۔''

سپرنٹنڈنٹ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمھاری والدہ راضی ہو جائے گی۔''

اور جب مسعود رقعہ لے کر بنگلے سے نکلا تو رات چھا چکی تھی اور سڑکوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا اور سڑکوں پر یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ نو بہار ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور پھر ریلوے اسٹیشن پر چلا گیا۔ شرفاء کے کمرے میں جا کر اس نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور دیر تک آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ جب وہ اسٹیشن سے نکلا تو نو بج چکے تھے۔ اس نے ٹانگہ باغ کے قریب چھوڑ دیا اور پیدل چلنے لگا۔ سڑکوں پر چہل پہل کم ہونے لگی۔ سیر کرنے والوں کی ٹولیاں باغ سے نکل کر خراماں خراماں گھروں کو جا رہی تھیں۔ چوراہوں کے سنتری جا چکے تھے اور سینماؤں کے سامنے کی رونق اندر ہال میں سمٹ گئی تھی۔ مسعود نے اندھیری گلی میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پھونس اُٹھا کر گپھا میں داخل ہو گیا۔ ریباں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سلفہ بھرے سگریٹ کا دم لگا کر بولی۔ ''آ گیا راجہ نل آ گیا۔''

رکنے کباڑیے نے کھنکار کر کہا۔ ''آنے دو۔ آگے کون سے تنگ بیٹھے ہیں۔''

لالو نے اپنی کانی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لال اوئے۔ پہلی تاریخ سے پہلے کیسے درشن دیے۔ ابھی تو چاند چڑھنے